

تدوین فقہ

(۴)

حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبہ بنیات

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

اور تلاش و جستجو کا یہ فطری تقاضا کم و بیش سب ہی میں موجزن تھا، لیکن مقربین بارگاہ نبوت جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج شناس ہونے کے ساتھ ساتھ رسالت و نبوت کے جلال و ہیبت سے بھی مرعوب تھے جو جتنا قریب تھا اسی قدر جلال نبوی سے اس کا قلب متاثر تھا، دنیا تو دنیا، دین کی باتوں میں بھی باوجود شدید ضرورت کے ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما جیسے مقربوں کو بھی جسارت نہیں ہوتی تھی، مشہور واقعہ ہے کہ نماز میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سہو کی صورت پیش آئی، سلام پھیر کر مصلیٰ سے آپ باہر بھی ہو چکے تھے، صحابہ حیران تھے کہ قصہ کیا ہے، اشاروں اشاروں میں ایک دوسرے سے کچھ کہہ رہا تھا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھنے کی ہمت کسی کو نہیں ہوتی تھی، راوی نے صراحتہ بیان کیا ہے کہ ابو بکر و عمر بھی موجود تھے لیکن

فہا باہ ان یتکلم ماہ (صحاح) پس دونوں بولنے سے ڈر رہے تھے۔

بالآخر ایک خاص طرز کے صحابی جن کو بطور ظرافت کے بارگاہ نبوت سے ذوالیدین (دو لمبھوں والے) کا خطاب اس لئے ملا تھا کہ ان کے ہاتھ معمول سے کچھ زیادہ لمبے تھے، پیغمبر کے وہی ذوالیدین آگے بڑھے، پوچھنے کی ہمت کرتے ہیں لیکن کتنی ہمت، ان کے سوال

اقصرت الصلوۃ ام نہیت یا رسول اللہ نماز کی رکعتیں کم کر دی گئی ہیں یا اللہ کے رسول آپ کچھ بھول گئے

سے اندازہ ہو سکتا ہے، یعنی براہ راست سہو کے انتساب کی جرات ذوالیدین کو بھی نہ ہو سکی۔ حالانکہ ان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ کبھی کبھی مذاق بھی فرمایا کرتے تھے۔ اس کرم نے انھیں کچھ شوخ بھی بنادیا تھا، دربار نبوت میں بہ نسبت دوسروں کے وہ کچھ زیادہ جری تھے حلقہ نبوی کا جو نقشہ

کان علیٰ رؤسہم الطیر گویا ان کے سروں پر پرند بیٹھے ہیں۔

کے الفاظ میں کھینچنے والوں نے کھینچا ہے وہ اسی جلال الہی کی طرف اشارہ ہے، یہی وجہ ہے کہ جیسا کہ صحاح کی حدیثوں میں آتا ہے کہ مقررین سر پر وہ رسالت ہمیشہ اس آرزو میں رہتے کہ ہم سے توڑ کے مارے کچھ پوچھا نہیں جاتا، کاش! کوئی دیہاتی اعرابی آجاتا جو اپنی بداوت کی وجہ سے ممکن ہے ایسے سوالات کر گزرے جن کے جواب میں ہم لوگوں کو کوئی جدید علم ہاتھ آئے، جب کبھی مجلس نبوی میں اس قسم کے کوئی صاحب آجاتے تھے اور اپنے عجیب و غریب سوال کا سلسلہ شروع کرتے تو صحابہ میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی تھی اور ہر ایک ہم تن گوش بن کر جوابوں کے ان موتیوں کو چیتا تھا۔

پھر جوں جوں فتوحات کا سلسلہ وسیع ہوا، اور وفود کا تانتا بندھا، انت نئے انداز کے مختلف طبائع اور مزاج کے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آنے لگے، اور موقع کو غنیمت جان کر جس کو موقع ملتا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھتا تھا۔ ان سوالات میں زیادہ تر تو ایسے ہی سوالات ہوتے تھے، جن کا دین سے تعلق ہوتا تھا۔ پھر بعض دفعہ تو ان سوالات کے جواب میں وحی نازل ہوتی، قرآن مجید میں تیرہ مقامات میں یسٹلونک کے لفظ سے جن امور کا ذکر ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ یہ ان ہی سوالات کے جوابات تھے جو صحابہ نے مختلف اوقات میں آپ سے دریافت کئے۔

لیکن اسی کے ساتھ سوالات کا ایک مستقل سلسلہ وہ بھی شروع ہوا، خصوصاً اجنبی نووارد لوگوں کی طرف سے جن کا تعلق دین سے نہ ہوتا تھا، انتہا یہ ہے کہ بعضوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم

اگر پوچھا کہ سب کا لفظ آیا کسی سرزمین کا نام ہے یا کوئی عورت اس نام کی تھی، ایک صاحب نے آکر دریافت کیا کہ کچے کبھی باپ، کبھی ماں کے ساتھ کیوں مشابہ ہوتے ہیں، ظاہر ہے کہ ان باتوں کا دین سے کیا تعلق ہے، لیکن بعض سادہ دل جو مذاق شناس نبوت نہ تھے، اس قسم کے سوالات بھی کر لیا کرتے تھے، گویا اس کی مثال وہی ہوئی جیسے کفارِ قریش نے ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے بجائے نبوت کے انجیری کا کام لینا چاہا تھا۔ جس کا ذکر قرآن میں بھی ہے، یعنی یہ مطالبہ پیش کیا کہ ہمارے ملک میں جو پھاڑ بھرے ہوئے ہیں ان کو صاف کر دو، اور ہمارے رنگستانوں میں نہریں جاری کر دو، وغیرہ، قرآن میں حق تعالیٰ نے اس کے جواب میں پیغمبر کو حکم دیا کہ ان بے وقوف پوچھنے والوں سے کہہ دو کہ

سبحان ربك هل كنت پاک ہے تیرا رب (اس قسم کی بے نظمیوں سے) نہیں ہوں

الا بشر ارسولا۔ میں لیکن ایک آدمی پیغمبر۔

یعنی میں خدا نہیں بشر ہوں، اور انجیری نہیں رسول ہوں، پیغمبر سے اس قسم کا مطالبہ گویا عالم کے موجودہ نظم کے بدلنے کا مطالبہ ہے، حالانکہ وہ تو اسی نظم کے اندر انسانوں کو کامیاب زندگی بسر کرنے کا طریقہ سکھانے کے لئے آتا ہے۔

اسی طرح بعض لوگ ایسے سوالات بھی کرتے تھے جن کا تعلق گو دین ہی سے ہوتا، لیکن اس کے نہ جاننے سے دین میں نہ اضافہ ہوتا تھا نہ کمی، اس سلسلے میں ایک صاحب نے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آکر یہ پوچھا کہ یا رسول اللہ جنت میں کپڑے بٹنے جائیں گے یا اللہ میاں سے سلائے بنے بنائے کپڑے وہاں پیدا کرینگے۔ سائل کے اس سوال کو سن کر بچاڑے صحابہ بھی ہنس پڑے، سائل کی خفت کو محسوس کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تسلی کی اور ہنسنے والوں سے فرمایا کہ

تضحکون من جاہل تم ایک نہ جاننے والے پر ہنستے ہو جو جانتے

یسال عالما (کنز العمال) والے سے پوچھ رہا ہے۔

پھر سائل کو مخاطب کر کے فرمایا کہ

تَنشَقْ عَنْهَا ثَمَارَ اہل جنت کو جو پھل ملیں گے ان ہی پھلوں سے پھٹ کر

اہل الجحۃ کپڑے باہر نکلیں گے۔ لہ

الغرض آخر زمانہ میں سوالات کا ایک لامحدود سلسلہ تھا جو نئے آنے والوں کی طرف

خدمت مبارک میں پیش ہوتا رہتا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طبعی نرم دلی اور موت نہیں چاہتی تھی کہ لوگوں کو بایوس کیا جائے اور جیسا کہ آپ کا قاعدہ تھا، انتہائی ملامت اور مسامحت کے ساتھ پوچھنے والوں کی تسلی فرمادیتے تھے۔

لیکن ایک طرف بعض سادہ مزاج بزرگوں کے عجیب و غریب سوالات اور دوسری طرف مدینہ منورہ میں آستین کے جو سانپ یہودیوں اور غیر یہودیوں کے طبقات سے منافقانہ طور پر مسلمانوں میں گھل مل گئے تھے ان کی قصداً شرارت بھی شریک ہو گئی، کبھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فطری نرم مزاجی کو دیکھ کر کوئی بوڑھی عورت بھی اپنے کسی کام کے لئے کسی گلی میں روک لیتی ہے تو آپ رک جاتے ہیں، جو کچھ کہتی رہتی ہے سنتے ہیں۔ پانچویں کالم کے اس گروہ نے سرگوشی کے بیاندہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سنانا شروع کیا، جس کے اسناد کے لئے بالآخر قرآن کو دخل دینا پڑا۔

دوسری طرف یہی بد بخت یہودی جن کے دین کی ہنڈیا پکنے کے بعد جل چکی تھی اور جیسا کہ ہمیشہ سوختہ اور برہنہ مذاہب کی آخری تاریخ کا خاتمہ چند لایعنی دوراز کا یہودہ سوالات و جوابات پر آکر منہ پھو جاتا ہے۔ کسی کا مذہب صرف دسترخوان اور باورچی خانہ کے مسائل میں چکر کھا کر ڈوب جاتا ہے کسی کی ایک کو تین، تین کو ایک بنانے میں ساری مذہبی قوت خرچ

لے اس دنیا میں بھی سینکڑوں بنانا قی چیزیں جو عجیب و غریب نظم کے ساتھ غیب سے ظاہر ہو رہی ہیں مثلاً مکہ کے منوں کو دیکھئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ باضابطہ بہتہ مضبوط غلافوں میں بند کر کے قدرت کی طرف سے کوئی پارسل آتا ہے اور اس کی مثالیں بکثرت ہیں ایک نمونہ ہے جس سے اس دنیا کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ ۱۲

ہو جاتی ہے، سنتے ہیں کہ بعض بعض ادیان میں آخری سوال و جواب یہ رہ گیا تھا کہ اللہ کے فرشتوں کی کتنی تعداد سوئی کے ناکے سے گزر سکتی ہے، ایک فرقہ کا تخمینہ دس ہزار تھا اور دوسرا بارہ ہزار کی تعداد پر مصر تھا۔ مدتوں دونوں فرقوں میں خوب رزم آرائیاں، کفش آزمائیاں ہوئیں۔ یہودی بھی اسی حال میں مبتلا تھے، اسی قسم کے دوران کارِ راحا حاصل سوالات سکھا سکھا کر لوگوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجتے اور جواب پر اصرار کرتے، بخاری میں ہے کہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ جس کا اونٹ گم ہو جاتا وہ بھی

این ساقق میری اونٹنی کہاں ہے۔

کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فتویٰ پوچھتا، بعضوں کو اپنے باپ کے متعلق کچھ اشتباہ تھا تو وہ بھی اپنے نسب نامہ کی تصحیح کے لئے پیغمبر کے پاس آتے اور

من ابی میرا باپ کون ہے

کا فتویٰ دریافت کیا۔ بالآخر اس مسئلہ کو بھی اپنے ہاتھ میں قرآن کو لینا پڑا۔ حق تعالیٰ نے سورہ مائدہ کی یہ شہور آیت نازل فرمائی

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا

عَنْ أَشْيَاءَ أَنْ تَبْدَلَ لَكُمْ تَسْوِئَةً

وَأَنْ تَسْأَلُوا عَنْهَا حِينَ يُنْزَلُ

الْقُرْآنُ تَبْدَلَ لَكُمْ عَفْوَ اللَّهِ

عَنْ أَشْيَاءَ أَنْ تَبْدَلَ لَكُمْ تَسْوِئَةً

وَأَنْ تَسْأَلُوا عَنْهَا حِينَ يُنْزَلُ

الْقُرْآنُ تَبْدَلَ لَكُمْ عَفْوَ اللَّهِ

عَنْ أَشْيَاءَ أَنْ تَبْدَلَ لَكُمْ تَسْوِئَةً

وَأَنْ تَسْأَلُوا عَنْهَا حِينَ يُنْزَلُ

الْقُرْآنُ تَبْدَلَ لَكُمْ عَفْوَ اللَّهِ

عَنْ أَشْيَاءَ أَنْ تَبْدَلَ لَكُمْ تَسْوِئَةً

وَأَنْ تَسْأَلُوا عَنْهَا حِينَ يُنْزَلُ

تنبیہ کی گئی کہ اگر پیغمبر سے تم نے گم شدہ اونٹ کی تلاشی یا اپنے نسب نامہ کی تصحیح کا کام لیا، اور جب وہ خدا سے علم پا رہا ہے تو جو واقعہ ہو گا وہی جواب دینا، ممکن ہے کہ جس باپ کی طرف ابھی منسوب ہو، یہ انتساب غلط ثابت ہو، اور اس کے بعد لگو گے پھر منہ بنانے کہ دیکھے صاحب پیغمبر ہمیں گالیاں دیتے ہیں۔

بہر حال جب یہ آیت نازل ہوئی تو اس قسم کے دوراز کار سوالات کا سلسلہ بند ہو گیا۔
کیونکہ اب بھی اگر کوئی خدا کے حکم کی خلاف ورزی کر کے ایسے سوالات کی جرات کرتا تو یہ
اس کے نفاق کا اعلان ہوتا تھا۔

عام مفسرین تو سورہ مائدہ کی آیت کی شان نزول یہی بیان کرتے ہیں لیکن جہان تک
میں خیال کرتا ہوں، اس کے سوا بھی قرآن کے اس قانون کا ایک بڑا اہم راز تھا جس کا سراغ
خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے اقوال اور طرز عمل سے ملتے، زیادہ تر اس بحث کے
چھپنے کی یہاں ضرورت اسی سلسلہ کے بیان کرنے کے لئے ہوئی۔

بات یہ ہے کہ قرآن پڑھنے والوں پر یہ بات تو پوشیدہ نہیں ہے کہ اسلام نے انسانی
زندگی کے جس جس شعبہ اور جن جن پہلوؤں کو اپنے دائرہ بحث میں درج کیا ہے، اس میں ایسی
کوئی چیز نہیں ہے جس کی اصل روح اور اس قانون کی جو اساسی بنیاد ہے اس کو عجیب و
غریب جامع و مانع ساتھ ہی انتہائی کچھ دار تعبیروں کے ساتھ قرآن میں بیان نہ کر دیا گیا ہو،
مثلاً باہمی تجارتی لین دین کے قانون کا ذکر کرتے ہوئے۔

یا ایھا الذین امنوا لا تأکلوا
اموالکم بینکم بالباطل
الا ان یکون تجارة عن
تراض منکم
یا اسی کے ساتھ۔

لا تظلمون ولا تظلمون نہ تم کسی پر زیادتی کرو، اور نہ تم پر زیادتی کی جائے۔
یہ چند لفظی ایک دو فقرے قرآن میں پائے جاتے ہیں، لیکن صرف ان ہی چند لفظوں کی
روشنی میں یہ مبالغہ نہیں کر رہا ہوں کہ فقہاء اسلام نے کم از کم پانچ چھ ہزار دفعات قانون تجارت
کے پیدا کئے ہیں، جن کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں مل سکتی ہے اور تقریباً ہی طرز عمل قرآن نے

اپنے تمام متعلقہ مباحث کے متعلق اختیار کیا ہے۔

جیسا کہ میں نے اپنے تہیدی بیان میں بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے، اس خاص طریقہ بیان کے اختیار کرنے کے جہاں اور بھی چند در چند وجوہ ہیں، دو اہم راز یہ ہیں کہ قرآن میں زندگی کے ہر شعبہ کے متعلق قوانین کے کلیات بلکہ کلیات سے بھی زیادہ بہتر طریقہ سے ہم اس چیز کو موجودہ محاورہ میں ”روح“ اور ”سنس“ کے لفظ میں ادا کر سکتے ہیں، بجائے اس کے جزئیات اور لامحدود جزئیات کے بیان کرنے کا اگر ارادہ کیا جاتا تو علم الہی کی لامحدود وسعت کے حساب سے واقعہ یہ ہے کہ ایک ایک قانون کی تفصیلات کے لئے بھی دنیا کا کاغذی مواد کافی نہیں ہو سکتا تھا، اور بالفرض اللہ میاں اپنی قدرت کاملہ سے اتنا کاغذ اور اتنی سیاہی بھی پیدا کر دیتے کہ ان کی قدرت غیر محدود ہے۔ لیکن ہم محدود قدرت والے انسانوں کے لئے اس کی حفاظت و نگرانی تعلیم و تعلم کا کام تو یقیناً ناممکن ہوتا۔ یہ بات کہ ہماری حفاظت و نگرانی کی قوت ہی کو لامحدود بنا دیا جاتا۔ بلاشبہ یہ تو ممکن ہے لیکن ہم میں وہ انسان نہیں باقی رہ سکتے تھے جو اب ہیں۔ اور میری گفتگو کا تعلق اس وقت ان ہی انسانوں سے ہے جو اپنے موجودہ حالات میں اس خاک دان ارضی پر پائے جاتے ہیں، جنوں اور دیوپری کی اولاد یا جبریل و میکائیل جیسے فرشتوں سے ہمیں بحث نہیں ہے۔

یہ تو پہلی بات ہوئی، دوسری بات یہ ہے جیسا کہ اشارۃً میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ اسلامی تعلیمات کے جو رجحانات ہیں ان میں ایک عام اور اہم رجحان ان کی سہولت اور ملت اسلامیہ محمدیہ کا ”السمیٰ“ ہونا ہے یعنی نرمی اختیار کرنا، یہ اس کی خاص خصوصیت ہے۔

لے خدا کے کلام اور خدا کے کام میں جو مشابہت ہے اس کی یہ بھی ایک مثال ہے مثلاً جسمانی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے ہمارے سامنے خدائی کا ایک تودہ بہ شکل زمین رکھ دیا گیا ہے۔ بظاہر کون خیال کر سکتا تھا کہ خاک کے اسی تودہ میں انگوڑوں کے خوشے، آمروں کی قاشیں، برفیوں اور اصرتیوں کے ذخیرے، کوٹ ٹیڑوانی الغرض وہ سب کچھ پوشیدہ ہے جسے ہم کھا رہے ہیں، پہن رہے ہیں، برت رہے ہیں، مگر کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اسی کچھ پانی سے یہ سب کچھ نکل رہا ہے۔ ۱۲۔

جس کی تصریح خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

بحثت بالملئۃ السمیحة میں ایک نئی برتنے والی ملت کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہوں

کے الفاظ میں فرمائی ہے، قرآن میں بھی

ما جعل علیکم فی الدین من حرج نہیں رکھی ہے تم پر خدا نے دین میں تنگی۔

انما یرید اللہ بکم الیسر ولا خدا تو تمہارے ساتھ آسانی ہی چاہتا ہے اور

یرید بکم الیسر۔ دشواری کو نہیں چاہتا۔

وغیرہ آیتوں کے سوا خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا تقریباً ہر موقع پر آسانی و سہولت

کے پہلو کو اختیار کرنا، صحابہ کو عام طور پر وصیت کرنا کہ

بشروا ولا تنفروا، یسروا لوگوں کو خوشخبریاں سنایا کرنا، انھیں بھڑکانا

ولا تحسروا (بخاری وغیرہ) آسانی اور سہولت عطا کرنا۔ دشواری مت پیدا کرنا۔

اسلام میں بظاہر بعض قوانین کی شکل و صورت کا ذرا حبیب ہونا، لیکن معاً اسی کے ساتھ

ایسے قیود کا اس میں اضافہ جن کی وجہ سے اس کی شدت کا خفت سے بدل جانا مثلاً زنا

کے جرم کی سزا کا قرآن میں سوتازیا نہ ہونا، اور شادی شدہ لوگوں کے لئے حدیثوں میں سنگسار

کرنے کا قانون، صورتاً بظاہر یہ قانون سخت معلوم ہوتا ہے، کبھی کبھی غیر اقوام کی طرف سے

اس سختی کی شکایت بھی سنی جاتی ہے لیکن اسی کے ساتھ اگر وہ اس پر غور کرتے کہ ہر دعوے کے

ثبوت کے لئے صرف دو گواہوں کو کافی قرار دیتے ہوئے جرم زنا کے ثبوت کے لئے خود قرآن میں

چار گواہوں کا نصاب اور حدیثوں میں اس پر یہ اور اضافہ کہ گواہ بھی چشم دید رویت کے ہوں

اور کیسی چشم دید گواہی کہ "کاملیل فی المکحلة" یا "کالرشاء فی البیور" یعنی سلائی سرمہ دانی

میں یا ڈول کی رسی جس طرح کنوئیں میں ہوتی ہے، ایسی حالت میں ہر ایک گواہ کے گواہی

دینے کے بعد مقدمہ ثابت ہوگا، اور گواہوں کو بھی اس کی دھمکی کہ بجائے چار کے اگر صرف

تین آدمی زنا کی شہادت دینگے تو ان پر قذف یعنی انتساب زنا کے بدلہ میں مدعی سزا کا علیہ

حد کا مطالبہ کر سکتا ہے، مطلب یہ ہے کہ گواہوں کے عام قانون جرح و تزکیہ کے سوا نصاب شہادت (یعنی چار گواہوں کی عینی رویت) کی عدم تکمیل کی صورت میں قذف کے جرم میں خود پیٹ جانے کا گواہوں کو خطرہ، ان تمام امور کو اگر ملا لیا جائے تو شہادت کی رو سے زنا کی اس خوفناک سزا کا نفاذ عملاً کچھ ناممکن ہی سا ہے۔ حتیٰ کہ فقہانے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ

لم یقتل عن السلف ثبوت سلف (کچھ علماء) سے یہ بات آج تک نہیں نقل
الزنا عند الامام بالشہادت ہوئی ہے کہ امام (حکومت) کے سامنے گواہی کی
اذر ویتہ اربعۃ رجال عدل راہ سے زنا کا مقدمہ کسی پر ثابت ہوا ہو، وجہ یہ ہے
علی الوصف المذکور ای کہ چار صاحبِ عدل آدمیوں کا کسی کو اس حال
کا المیل فی المحکمۃ کا فی میں دیکھنا جیسے سرمہ دانی میں سلائی ہو جیسے
الکلاب فی غایتہ الذمۃ۔ کتوں کو دیکھا جاتا ہے بہت ہی نادر الوقوع
(عنایہ علی الہدایہ مصری) بات ہے۔

بہر حال شہادت کی راہ سے تو اس سزا کے ثبوت کا یہ حال ہے، رہا یہ کہ کوئی حکومت کے سامنے خود اپنے اس جرم کا اقرار کر لے تو اس باب میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ماغرا مسلمی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے متعلق جو اسوہ اور نمونہ حدیثوں میں مروی ہے، اگر اس کو پیش نظر رکھا جائے یعنی گناہ کی اذیت کے احساس سے حضرت ماغرا کی پاک فطرت بے چین ہو ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ان کو جرم کے اقرار پر مجبور کرتی ہے، وہ خود بڑھ بڑھ کر احتجاج کرتے ہیں کہ خدا کے ایک مجرم پر خدا کا قانون نافذ کیا جائے۔ لیکن سب جلتے ہیں کہ پیغمبر نے ایک بار نہیں، بار بار ان کے اقرار کی سماعت سے اعراض کرنا چاہا، حتیٰ کہ جب انھوں نے سننے پر مجبور ہی کر دیا تو آپ نے لوگوں کو حکم دیا کہ ان کا منہ سونگھیں، شراب پی کر نشہ میں تو نہیں کہہ رہے ہیں۔

محدثین کا بیان ہے کہ مقصد یہ تھا کہ وہ اپنے بیان کو نشہ پر اگر محمول کر دیں تو جرم زنا کی کڑی سزا سے بچ کر صرف شراب خواری کی ہلکی سزا پر بات ٹل جائے گی، لیکن آخرت کے عذاب کو جو دنیا کے عذاب سے زیادہ سخت یقین کر چکے تھے ان حضرت ماعز رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی جان عزیز کو اپنے مالک کے قانون کے سپرد فرما دیا، اسی لئے حدیثوں میں آیا ہے کہ ان کی توبہ نے وہ وزن حاصل کیا، جس کا مقابلہ آسمان زمین کا وزن بھی نہیں کر سکتا ہے ظاہر ہے کہ فطرت انسانی میں احساس گناہ کے متعلق اتنی نزاکت و ذکاوت پیدا ہو جانا نبوت ہی کا گویا معجزہ قرار پا سکتا ہے، عام حالات میں اس کا وقوع بھی آسان نہیں ہے۔ بہر حال میری غرض اس واقعہ کے بیان کرنے سے اس مقصد کی تائید ہے جو اسلام کے تیسری نقطہ نظر میں عموماً پایا جاتا ہے، یعنی حتی الوسع یہ چاہا جاتا ہے کہ جہان تک ممکن ہو دینی زندگی گزارنے میں کسی قسم کی دشواری نہ ہو، عوام پر سختی نہ ہو جائے، یہی تراویح کی نماز ہے، اہل علم میں اس واقعہ سے کون ناواقف ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چند راتوں کے بعد یہ فرماتے ہوئے کہ

خشیت ان یکتب علیکم بحیث اندیشہ ہے اس بات کا کہ یہ نماز تم پر فرض ہو جائے
ولو کتب علیکم ما قمت بہ اور اگر فرض ہو جاتی تو پھر تم اس نماز کے ساتھ کھڑے
(بخاری و مسلم وغیرہ) کھڑے نہ ہوتے (یعنی اس کا عہدہ برائ نہیں ہو سکتے)۔

خود جماعت کے ساتھ اس نماز کا پڑھنا ترک فرما دیا، ظاہر ہے کہ مقصد مبارک یہی ہو سکتا ہے کہ اگر میں جماعت کے ساتھ ہر سال اس نماز کو پڑھتا رہا تو آئندہ چل کر میری مداومت کی وجہ سے اس کا اندیشہ ہے کہ مسلمانوں پر یہ نماز بھی وجوب اور فرضیت کی شکل اختیار نہ کر لے تاکہ آئندہ گرفت اور مطالبہ میں سختی نہ کی جائے۔ اسی لئے آپ نے اس نماز کو جماعت کے ساتھ پڑھنا ترک فرما دیا اور صحابہ کو بھی اس کے پڑھنے سے اپنے زلے میں جماعت کے ساتھ منع فرما دیا۔

۱۔ بخاری و مسلم میں ہے کہ مندرجہ بالا الفاظ ارشاد فرمانے کے بعد صحابہ کرام سے (باقی حاشیہ پر ملاحظہ ہو)

یقیناً اس سے بھی اسی اصول کی طرف رہنمائی ہوتی ہے کہ قوانین و احکام کی
 اصلی روح کو محفوظ کر دینے کے بعد قرآن میں جزئیات کی تشریح و تفریع میں اجمال اور سکوت
 کی راہ جو عموماً اختیار کی گئی ہے حتیٰ کہ نماز اوقات نماز تک کی یہ حالت ہے کہ اس کی اصلی روح
 وما امر الا للعباد واللہ اور نہیں ذمہ دار ٹھہرائے گئے ہیں لیکن صرف اسی بات کے
 مخلصین لہ الدین کہ پوچے جائیں اشکو، دین کو اسی کیلئے خالص کرتے ہوئے
 یا نماز کا اصل مقصد

اقم الصلوۃ لذکرہ کھڑی کرو نماز کو میری یاد کے لئے۔

نمازیوں سے جس چیز کا حقیقی مطالبہ ہے اسے

الخاصعین الذین یظنون خشوع طاری کرنے والے اپنے آپ پر دھیان جلتے ہیں اس

انھم فلاقوا ربھم بات کا، کما اپنے رب سے وہ ملاقات کر رہے ہیں۔

وغیرہ آیتوں میں محفوظ کر کے نماز کے ظاہری عناصر و اجزاء مثلاً قیام و رکوع، سجود، قنارۃ وغیرہ کا
 ذکر کچھ ایسے طریقہ سے مختلف مقامات میں مختلف حیثیتوں سے کیا گیا ہے کہ نماز اور اس کے
 اجزاء کی باہمی ترتیب کی جو موجودہ شکل و صورت ہے، قرآن سے اس کے نکلنے کی کوشش

(بقیہ حاشیہ ص ۲۲۶) آپ نے فرمایا کہ فعلیکم بالصلوۃ فی ہونکم، یعنی اس نماز کو تم لوگ گھر میں پڑھو یا کرو جس کا
 مطلب یہی ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں تراویح کی جو نماز چند دن پڑھی گئی اس سے لوگوں کو روک
 دیا گیا، یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ تیرہ سو سال تک مسلمان جس نماز سے نبوی فرمان کی تعمیل میں رکے ہوئے تھے، اسی
 ممنوعہ نماز کو اس زمانہ میں بنام تراویح پڑھنے کی کیوں کوشش کی جا رہی ہے، عام مسلمان تراویح کے نام سے
 جو نماز رمضان میں پڑھتے ہیں وہ یہ سمجھ کر پڑھتے ہیں کہ یہ عہد نبوت کی نماز نہیں ہے بلکہ خلفاء راشدین کی قائم کردہ
 سنتوں میں سے ایک سنت ہے یعنی حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں اس کو قائم فرمایا چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے
 خلفاء راشدین کی سنت کو بھی سنت ہی فرمایا ہے اس لئے عمری تراویح پر بھی سنت کے لفظ کا اطلاق کیا جاتا
 ہے اس سے تراویح کی رکعتوں کا مسئلہ طے ہو جاتا ہے یعنی آٹھ رکعت والی تراویح عہد نبوت کی تو حکم نبوی
 ممنوع ہو چکی تھی، اس آٹھ رکعت کو کچھ پڑھنا ارشاد نبوی کی خلاف ورزی ہے۔ باقی بیس رکعت والی تراویح
 سب سے حضرت عمرؓ والی تراویح ہے اور یہ بیس رکعت ہی کے ساتھ ادا ہوتی ہے۔

ظاہر ہے ایک بے سود اور لا حاصل کوشش ہوگی۔

اور یہ قصہ کچھ ایک نماز ہی کا نہیں ہے، اسلام کے ارکانِ ہمہ، زکوٰۃ، صوم، حج وغیرہ وغیرہ کی جو تفصیلات ہیں، کیا کسی کے بس میں ہے کہ مجرد قرآنی آیات سے ان کو نکال کر دکھائے حضرت عمران بن حصین صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسی قسم کی توقع رکھنے والے ایک آدمی کو مخاطب فرماتے ہوئے کہا تھا۔

انک امرا احنی اتجد فی تم تو ایک بیوقوف آدمی ہو کیا کتاب اللہ میں تم یہ پاؤ گے
کتاب اللہ الظہر اربعا ولا ہو کہ نماز پھر کی رکعتوں کی تعداد چار ہے اور یہ کہ اس میں
یجھر فیہا بالقراۃ علی قراۃ جہر (آواز کے ساتھ نہ ہونا چاہئے۔

حضرت عمرانؓ زکوٰۃ اور اسی قسم کے چند دوسرے اسلامی ارکان کے نام لے لیکر اس شخص سے پوچھتے جاتے تھے۔

انجد هذا فی کتاب اللہ مفسرا کیا کتاب اللہ میں اسے تم مفسر اور مفصل حال میں پا سکتے ہو
آخر میں آپ نے فہمائش فرماتے ہوئے کہا

ان کتاب اللہ اجمہر هذا کتاب اللہ نے ان چیزوں کو مبہم اور محمل شکل میں بیان کیا
وان المسئۃ تفرد لک ہوا و سنت نے ان کی تشریح و تفسیر کی ہے۔

قرآنی مطالبات میں اجمال و ابہام کا یہ رنگ کیوں اختیار کیا گیا؟ منجملہ دیگر وجوہ و مصلحتوں کے جہاں تک میں خیال کرتا ہوں

یرید اللہ بکم اللیسر ولا چاہتا ہے اللہ تمہارے ساتھ آسانی، نہیں چاہتا
یرید بکم العسر تمہارے لئے دشواری۔

اور اس جیسی مختلف آیتوں میں جس تفسیر اور نرمی کے عام رجحانہ اور رؤفانہ دستور کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اگر اس کو بھی اس طرزِ عمل کے اختیار کرنے میں دخل سمجھا جائے تو میرے

نزدیک اس کے انکار کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی، ورنہ ظاہر ہے کہ تفصیل و تفسیر کا ارادہ اگر قرآن میں کر لیا جاتا تو اس سے بہتر تفسیر و تفصیل اور کس کی ہو سکتی تھی۔

پنچیر کی عام تبلیغ | بہر حال قرآن میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے، اور قصداً اختیار کیا گیا ہے۔ بلکہ کی ایک خصوصیت | جہاں تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل سے معلوم ہوتا ہے، خصوصاً

علمائے اخاف کا اس باب میں جو خیال ہے اس بنیاد پر تو یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اپنی عام تبلیغ کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی قرآن کے اجمالی مطالبات کے صرف ان ہی تفصیلات و تشکیلات تک محدود رکھنے کی قصداً پوری کوشش کی ہے جن کا مسلمانوں کی زندگی سے عمومی و وجودی تعلق تھا۔ یا علامہ ابوبکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں۔

ما یلزم الکافة ویکونون عام مسلمانوں کے لئے جن کی تعیل لازم تھی اور فرض۔

متعبدین فیہ بفرض لا یجوز کی صورت میں جن کی بجا آوری ان کے لئے اس لھم ترکہ ولا یخالفہ طریقہ سے ضروری تھی کہ جن کا نہ ترک کرنا جائز تھا اور نہ اس کی مخالفت روا تھی۔ (ج ۱ ص ۲۰۳)

اپنی فقہی تفسیر میں علامہ نے اس بڑے اہم اسلامی ”اساس“ کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کل ما بالناس حاجۃ عامۃ فلا بد جن شرعی امور کی ضرورت عام مسلمانوں کو ہے ان بیكون من النبی صلی اللہ پیغمبر پر ضروری ہے کہ امت کو اس سے واقف علیہ وسلم توفیق الالامۃ علیہ بنائیں۔

۱۔ علامہ ابوبکر جصاص جن کا اصلی نام احمد بن علی ہے فقہار اخاف کے ان بزرگوں میں ہیں جنہیں مجتہد فی المذہب کے لقب سے ملقب کیا گیا ہے۔ مولانا عبدالحی فرنگی محلی لکھا ہے کہ شمس الائمہ وغیرہ جن کا شمار مجتہدین فی المذہب کے سلسلہ میں کیا جاتا ہے۔ کلہم عیال علیہ یعنی ابجصاص کے سب ہی منت شناس ہیں۔ دیکھو فوائد بہیص ۱۶ مطبوعہ ہند، علامہ ابجصاص کی ولادت ۳۸۴ھ میں اور وفات ۴۴۴ھ میں ہوئی۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ فقہ کے ساتھ علم حدیث میں بھی نمایاں قابلیت کے مالک تھے جس کی بڑی دلیل ان کی مشہور فقہی تفسیر ہے جو حال میں قسطنطنیہ میں شائع ہوئی ہے۔ ۱۲۔

وہ لکھتے ہیں کہ یہی وجہ ہے جس کی بنیاد پر

قال اصحابنا ما كان
من احكام الشريعة
بالناس حاجۃ الى معرفۃ
قسييل ثبوته الاستفاضة
وانحدر الموجب العلم
ہمارے اصحاب (امام ابو حنیفہ، ابو یوسف، محمد وغیرہ)
کا قول ہے کہ شریعت کے جن احکام کے جاننے کی عام
لوگوں کو ضرورت ہو ان کے ثبوت کیلئے ضروری ہو کہ
وہ عام طور پر امت میں شائع ذرائع ہوں اور ان
کی خبر ایسے قوی ذریعہ سے پہنچی ہو جس سے یقین
پیدا ہو سکتا ہو۔

علامہ نے پھر بڑی تفصیل سے اس مسئلہ کو سمجھایا ہے ایک موقع پر اسی قسم کے چند
شرعی احکام کا ذکر کر کے وہ فرماتے ہیں۔

ما كانت البلوى عامۃ من كافة الناس
بھذا الامور ونظائرھا تغیر
جاؤن ان یكون فی حکم الله تعالیٰ
من طریق التوقیف الا وقد
بلغ النبی صلی الله علیہ وسلم
ذلك ووقف الکافة۔
یہ یا ان جیسی چیزوں میں چونکہ عام لوگوں کو مبتلا
ہونا پڑیگا، اور ہر ایک سے ان کا تعلق ہوگا تو عام
لوگوں کو ان سے واقف کرنا خدا کی طرف ضروری
ایسی صورت میں اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ
پیغمبر نے اس کی یقیناً تبلیغ کی، اور عام لوگوں
(الکافہ) کو ان سے واقف بنایا۔

اسی بنیاد پر وہ کہتے ہیں کہ جن چیزوں کو ان کی عمومیت کی وجہ سے پیغمبر الکافہ اور
عام لوگوں تک پہنچایا۔ تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ پیغمبر سے جو چیزیں الکافہ تک پہنچی ہوں،
ان کے بیان کرنے والے بجائے الکافہ اور عام لوگوں کے اکتے دے صرف چند لوگ ہوں،
علامہ فرماتے ہیں۔

غير جائز علیہا ترك
النقل والاقتصار علی ما
ان عمومی مطالبات کے متعلق کسی طرح یہ بات جائز
نہیں ہو سکتی کہ لوگوں نے ان کی نقل و بیان کو چھوڑ دیا

ينقله الواحد بعد اور صرف اسی پر پھر وسہ کر لیا ہو کہ ایک آدمی کے

الواحد - ۱۰ بعد ایک آدمی بھی اگر بیان کر دے گا تو وہ کافی ہوگا

علامہ نے ایک فقہی مثال سے بھی اس مسئلہ کو سمجھانا چاہا ہے بلکہ اسی مسئلہ کے ذیل

میں انھوں نے حنفی مکتب خیال کے ”اس اساسی قانون“ کا تذکرہ فرمایا ہے۔

انھوں نے رویت ہلال کے مسئلہ کا ذکر کیا ہے، یعنی رمضان کے چاند کا لوگوں کو انتظار ہو، اور فرض کرو کہ ابرو غبار اور ہر قسم کی آلودگی سے مطلع صاف ہو، نگاہیں ٹکٹکی باندھے افق پر چاند کو تلاش کر رہی ہوں، تلاش کرنے والوں کی بینائیوں میں کسی قسم کا سقم اور خرابی بھی نہ ہو، ایسی صورت میں عام مجمع کے خلاف صرف ایک یا دو آدمی اگر دعویٰ کر بیٹھیں کہ میں نے چاند دیکھا ہے، تو ان کا یہ دعویٰ اور ان کی یہ خبر کیا درخور اعتنا اور قابل قبول ہو سکتی ہے؟ علامہ فرماتے ہیں۔

فخیر جائز ان یطلبہ ہمہ یکمھی ممکن نہیں ہو سکتا کہ ایک بڑا مجمع چاند کو ڈھونڈے

الجمع الکثیر ولا علت بالسلامہ رہا ہوا اور آسمان میں کسی قسم کی علت (گرد وغبار)

مع توافی صرہم علی ابرو غیرہ) بھی نہیں ہے، ان ڈھونڈنے والوں میں

رویتہ ثم یراکہ النفر الیسیر ہر ایک چاہ رہا ہے کہ چاند پر اس کی نظر پڑ جائے ہر ایک

منہم ولا یراہ الباقون کو اسی کی لوگی ہوئی ہو مگر باوجود اس کے صرف چندا کے

مع صحۃ البصار ہم دے آدمی تو چاند کو دیکھ لیں اور اپنی بینائیوں کی صحت

وارتفاع الموائع عنہم سلامتی کے ساتھ دوسرے نہ دیکھ پائیں حالانکہ موانع

غبار و ابرو وغیرہ) بھی موجود نہیں ہیں۔

پھر خود ہی جواب دیتے ہیں۔

فاذا اخبر بذلك النفر پس یہ چندا کے دے چاند کے دیکھنے کے دعویٰ

۱۰ تفسیر الی بکرمہ ص ۱۰ ص ۲۰۳۔

اليسير مضمردون کرنے والے اگر چاند ہونے کی خبر کا فائدہ یعنی عام
کا فائدہ ہم علما انھم غالطون جمع کے مقابل میں دیں گے تو ہم ہی باور کریں گے کہ یہ
غیر مصیبین فاعلان دیکھنے والے ہی غلطی پر ہیں اور جو خبر یہ دے رہے ہیں
یکون رؤا خیالاً فظنوه وہ صحیح نہیں ہے اب خواہ یہ ہوا ہو کہ ان لوگوں نے
هلاکاً ولتعمدوا الکذب خیالی چاند کو واقعی چاند سمجھ لیا ہو، یا قصداً غلط
بیانی کر رہے ہوں۔ (ص ۲۰۲)

اور صرف علامہ جصاص ہی نے نہیں "تشریح اسلامی" کے اس مہتمم بالشان اصول
کی طرف حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی براہ راست خود ہی اپنی اس مشہور تصنیف
"رسالہ" میں بھی اشارہ فرمایا ہے جو اصول فقہ کی دنیا میں سب سے پہلی کتاب ہے، گو کچھ
طوالت تو ضرور ہوگی مگر میرے نزدیک چونکہ فقہیات کی تدوین کی یہ بڑی اہم بنیاد ہے،
اس لئے امام کے بھی جتنے جتنے فقرے نقل کرتا ہوں۔

جو چیزیں مسلمانوں میں اس نام سے پائی جاتی ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم
کی وہ پیش کی ہوئی ہیں، حضرت امام نے علم کے اس ذخیرے کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے
ایک حصہ کی تعبیر ان الفاظ میں فرمائی ہے۔

ما نقلتہ عامۃ عن عامۃ ایک وہ ہے جو عامہ سے عامۃ تک منتقل ہوتا
(رسالہ ص ۱۲۷) ہوا چلا آ رہا ہے۔

امام فرماتے ہیں۔

وهذا الصنف من العلم کلمہ علم کی اس قسم میں ایک تو وہ چیزیں مندرج ہیں
موجود نصاً فی کتاب اللہ جل جو صراحتہ اللہ کی کتاب میں پائی جاتی ہیں، اور
شائعہ و موجودۃ عامۃ عند اہل الاسلام دوسری وہ ہیں مذہب اسلام میں اس طور پر پائی جاتی
و یقلد عوامہ عن من مضی عن ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرتے

عوا محمد یحیٰ کو نہ عن رسول اللہ ہوئے علامۃ المسلمین انھیں ان عام مسلمانوں پر نقل کرتے
صلی اللہ علیہ وسلم (ص ۱۲۷) ہوئے چلے آ رہے ہیں جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔

گویا امام کے نزدیک قرآنی مطالبات کے ساتھ وہ ساری چیزیں اسی صنف میں داخل ہیں،
جنہیں ایک نسل سے دوسری نسل تک ایک طبقہ سے دوسرے طبقہ تک آنحضرتؐ کی طرف
منسوب کرتے ہوئے مسلمان اس طریقہ سے بغیر کسی ادنیٰ وقفہ اور ایک لمحہ کے انقطاع کے
منتقل کرتے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ جیسے قرآن ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتا ہوا
پہنچا ہے کہ مسلم ہی نہیں ایک غیر مسلم کے لئے بھی خدا کی طرف قرآن کا انتساب یہ تو محل بحث و نظر
ہو سکتا ہے، لیکن یہ وہی کتاب ہے جسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کی طرف سے
دنیا میں پیش کیا ہے، اس کا انکار ان تمام قطعیات کا انکار بن جاتا ہے جن کے ماننے پر تو اترو توافق
کا قانون انسانی فطرت کو مضطر اور بے بس کئے ہوئے ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف قرآن کا انتساب جس بنیاد پر قطعی
اور یقینی ہے، بحسنہ ہی حال ان تمام شرعی حقائق کا ہے جو علم و یقین کی اسی راہ سے مسلمانوں
تک پہنچے ہیں۔ امام کے الفاظ میں ان کا علم بھی

علم عامۃ مایسع ایک ایسے عام علم کی حیثیت و نوعیت رکھتا ہے کہ
بالغایہ مغلوب علیٰ ایک عاقل بالغ جس کی عقل جنوں کے نیچے دبی نہ ہو
عقلہ جملہ۔ وہ ان سے جاہل نہیں رہ سکتا۔

پھر بطور مثال کے امام نے سمجھاتے ہوئے لکھا ہے۔

مثل ان الصلوٰۃ خمس وان مثلاً یہ بات کہ نماز پانچ وقتوں کی فرض ہے، لوگوں
علی الناس صوم رمضان و پر رمضان کے روزے فرض ہیں۔ بیت اللہ کا
حج البیت ان استطاعوا زکوٰۃ حج بشرط استطاعت فرض ہے ان کے اموال
فی اموالہم و ان حرم علیہم میں زکوٰۃ فرض ہے، سود، چوری، زنا، شراب

الربوا والسرقة والزنا والخمر یہ چیزیں ان پر حرام ہیں، اور جو بھی
دکان فی معنی هذا لہ ایسی چیزیں ہوں۔

ظاہر ہے کہ یہ سب ایسی چیزیں ہیں، جن کا ذکر یا تو قرآن میں صراحتاً پایا جاتا ہے یا قطعیت کی
جس راہ سے قرآن کا علم اگلی نسلوں سے منتقل ہو کر پچھلی نسلوں تک پہنچا ہے، اسی راہ سے
جو چیزیں ہم تک پہنچی ہیں یعنی وہی ”ما نقلہ عامۃ عن عامۃ“ کی راہ ان کی بھی ہے، اور
بحمد اللہ یہ حال ان تمام شرعی مطالبات کا ہے جن کا تعلق عام مسلمانوں کی زندگی کے ساتھ
وجوب و لزوم کا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کے بعد جن شرعی مطالبات کی تعمیل عام مسلمانوں کے لئے
ضروری اور ناگزیر تھی، پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تبلیغ عام کو چونکہ ان ہی کی حد تک محدود رکھا
یہی وجہ ہوئی کہ جو چیزیں ایسی نہ تھیں جہاں تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل سے معلوم
ہوتا ہے زیادہ تر یا تو ان سے خاموشی ہی اختیار فرمائی گئی یا کسی وجہ سے اگر ان کے متعلق کچھ فرمایا
بھی گیا ہے تو اس طریقہ سے کہ مسلمانوں میں وہ انحصار کے الفاظ میں۔

ما یقلہ الواحد بعد واحد جے ایک کے بعد ایک نے بیان کیا ہو،
کی شکل میں منتقل ہوئیں، یا امام شافعی نے جس کی تعبیر ان الفاظ میں فرمائی ہے یعنی
خبر الواحد عن الواحد حتی ینقی ایک کی خبر ایک سے تلاً لکھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم
الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جائے۔

اف بزرگوں کا اشارہ دراصل دین کے اس ذخیرے کی طرف ہے، جن کے ثبوت کا ذریعہ بجز
ان حدیثوں کے جنہیں اصطلاحاً اخبار احاد کہتے ہیں اور کچھ نہیں ہے، مطلب یہ ہے کہ ان کے
ساتھ بھی اگر تبلیغ عام کا طریقہ اختیار کر کے ان میں بھی استفادہ اور عومیت کی وہی کیفیت
پیدا کر دی جاتی جو ان چیزوں کا حال ہے جن کی تعمیل ہر مسلمان کے لئے عام حالات میں ناگزیر ہے۔

تو پھر ان کے مطالبہ کا رنگ بھی وہی شدت اختیار کر لیتا اور شارع علیہ السلام کا یہ مقصود نہ تھا
ابحصاص لکھتے ہیں کہ خبر احاد ہونا ان کا، یہی دلیل اس بات کی ہے کہ

فیہم مخیرون فی ان مسلمانوں کو ان امور کے متعلق اختیار ہے کہ جو احادیث
یفعلا واما شاؤا واما الخلف کریں (یعنی ترک و فعل کا اختیار ہے) فقہاء میں ان کے
بین الفقہاء فیہ فی الافضل متعلق اختلاف جو کچھ ہے وہ افضلیت میں ہے
منہ (ص ۲۰۴) یعنی کرنا افضل ہے یا نہ کرنا۔

ابحصاص ان چیزوں کو چن کر شرعی مثالوں سے سمجھاتے ہوئے کہتے ہیں۔

وہذا سبیل ما ذکرتم من امر یہ حال ان چیزوں کا ہے جن کا میں نے ذکر کیا
الاذان والاقامۃ و تکبیر یعنی اذان اقامت (کے الفاظ کی تعداد کا جو مسئلہ ہے)
العیدین والتشریق ونحوھا یا عیدین و تشریق کی تکبیروں کا جو حال ہے
من الامور التي نحن مخیرون کہ یہ ایسے امور ہیں جن میں ہمیں اختیار
بخشا گیا ہے۔

پھر اس شبہ کے ازالہ کے لئے کہ جب مسلمانوں کو اختیار دیا گیا ہے تو ان ہی امور کے
متعلق فقہاء میں اختلاف کیوں پایا جاتا ہے اگرچہ پہلے بھی جواب کی طرف اشارہ کر چکے ہیں، لیکن
دہرا کر پھر فرماتے ہیں۔

انما الخلاف بین الفقہاء فقہاء کا اختلاف ان امور میں صرف اس حد تک
فی الافضل منہا۔ ہے کہ افضل اور بہتر کیا ہے۔
علامہ نے اس کے بعد لکھا ہے۔

فلذلك جازر و بعض الاخبار یعنی ان امور کی خصوصیت ہی کا نتیجہ ہے کہ بعض
فیہ من طریق الاحاد خبروں کا بطریق احاد وارد ہونا جائز ہوا۔

کیونکہ بالفاظِ بصاص

لیس علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم جن چیزوں میں مسلمانوں کو اس قسم کا اختیار دیا گیا ہو،
توقیفہم علی الافضل مما ان میں افضل اور بہتر کیا ہے، ان سے الکافہ (یعنی
خیرہم فیہ۔ عامۃ الناس) کو مطلع کرنا پیغمبر کے لئے ضروری نہیں ہے۔

پھر آحاد ذرائع سے جو حدیثیں مروی ہیں ان میں کبھی کبھی جو اختلاف پایا جاتا ہے مثلاً
رکوع سے اٹھنے اور رکوع میں جانے کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ اٹھانے
کا مسئلہ ہے جسے رفع الیدین کہتے ہیں، ان ہی احاد خبروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ
کو ہاتھ اٹھاتے دیکھا گیا اور بعضوں سے ثابت ہوتا ہے کہ نہیں دیکھا گیا۔ اسی طرح بعض روایتوں
سے معلوم ہوتا ہے کہ آمین زور سے کہی جاتی تھی، بعضوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آہستہ سے —
جصاص ان کے متعلق اپنا خیال یہ ظاہر کرتے ہیں کہ

یجمل الامر علی ان النبی یعنی یہ سمجھا جائیگا کہ ان میں ہر دو پہلو کا مسلمانوں
صلی اللہ علیہ وسلم قد کا د کو اختیار ہے، اسی کو بتانے اور اسی کی تسلیم
منہ جمیع ذلك تعلیما منہ دینے کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سب
وجه التخییر۔ باتیں وقوع پذیر ہوئی ہیں۔

حضرت امام شافعیؒ نے بھی اس قسم کی چیزوں کے متعلق رسالہ میں اس کی تصریح
کی ہے کہ عوام میں ان کا شائع اور مستفیض ہونا ضروری نہیں بلکہ

علم الخاصة من خبر یعنی خاص آدمی کی خبر چونکہ ہوتی ہے اس لئے ان کا
التخاصہ یعرفها العلماء علم بھی خاصہ ہی تک محدود رہتا ہے، یہی وجہ ہے
ان کو علم والے ہی جانتے ہیں۔ (ص ۱۲۷)

گویا حاصل یہ ہوا کہ شریعت اسلامی کے وہ سارے عناصر و اجزاء جن کی عامۃ الناس
کو حاجت تھی، پیغمبر نے ان کی تبلیغ ہی اس شان کے ساتھ کی اور اسی شان سے کرنا بھی چاہئے
تھا، کہ عام مسلمانوں میں وہ شائع و ذائع ہو گئے، اور پہلی نسلوں نے پچھلی نسلوں تک ان کو

اس طرح پہنچا دیا کہ قریب قریب ان کی حیثیت ان امور کی ہو گئی ہے جن میں تواتر کی وجہ سے شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں ہے، تقریباً اور دین کی ایسی ساری چیزیں جن پر مسلمانوں کا اتفاق ہے ان کا یہی حال ہے، اسی لئے میں کہتا ہوں کہ قرآن ہی نہیں بلکہ قرآن کے سوا بھی جو چیزیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہیں ان کا ایک بڑا عظیم حصہ منواتر ہے۔

ایک نماز ہی کو لے لیجئے، قرآن میں تو صرف اقبیہ الصلوٰۃ کا مطالبہ کیا گیا ہے لیکن جیسا کہ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا نماز ظہر کی رکعتوں کا چار یا مغرب کی تین، صبح کی دو ہونا، یا ہر رکعت میں ایک رکوع اور دو سجدوں کا ہونا، یا ازیں قبل نماز کے وہ سارے اجزاء جن پر مسلمانوں کا اتفاق ہے، یہ ہم تک جو منتقل ہوئیں تو اسی طریقہ سے ہوئی ہیں کہ لاکھ ڈیڑھ لاکھ صحابہ دین میں پانچ دفعہ ان پر عمل کرتے تھے، ان سے نماز کی یہی شکل ان کے بعد والی نسل تک پہنچی اور ان سے ان کے بعد والوں تک تا انیکہ پہلی صدی ہجری میں زمین کے باشندوں کی کروہ کر ورتعداد رکھنے والی ایک قوم کا وہ اجتماعی عمل بن گیا اور نسلاً بعد نسل وہی اجتماعی عمل مسلمانوں میں منتقل ہوتا ہوا چلا آ رہا ہے۔ اور یہی حال ان عام اعمال و افعال کا ہے جن کا جصاص کے الفاظ میں ”کافۃ الناس“ سے اور ابام شافعہؒ کے الفاظ میں ”العامة“ سے تعلق ہے یہی بنیاد ہے اس دعویٰ کی کہ قرآن کے بعد حدیث کا وہ سارا ذخیرہ جس کا تعلق ان ہی کافۃ الناس والے امور سے ہے، ان کی حیثیت گویا متواتر کی ہے اور میں نہیں جانتا کہ بحران لوگوں کے جو بقول امام شافعیؒ مغلوب العقل ہوں کوئی اس دعویٰ کی صداقت میں مذہب ہو سکتا ہے۔

لیکن اسی کے مقابل میں دین کے جن مطالبات کی یہ کیفیت نہ تھی وہ اگر ہم تک آحاد خبروں، یا الواحد عن الواحد کی راہ سے پہنچے ہیں تو ان کے متعلق یہ خیال کرنا کہ یہ کسی اتفاقی حادثہ کا نتیجہ ہے صحیح نہ ہوگا۔ بلکہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خود ہی ان کے متعلق کچھ ایسا طرز عمل اختیار فرمایا کہ ان میں استفاضہ و شہرت و شروع کی وہ کیفیت پیدا نہ ہو سکی۔ پس خبر احاد کی شکل میں ان کا منتقل ہونا، یہ واقعہ ہوا نہیں ہے بلکہ کیا گیا ہے اور قصداً کیا گیا ہے۔ نبوت کی دور رس

نگاہ سے یہ راز اوجھل نہیں رہ سکتا تھا کہ عہد نبوت میں ان کے ساتھ اگر یہ طرزِ عمل اختیار نہ کیا جائے گا تو ان میں بھی وہی رنگ بالآخر پیدا ہو جائے گا جو ضروریاتِ دین کے مطالبہ کا رنگ ہے تراویح کی نماز کی مثال گزر چکی یعنی اسی اندیشہ سے کہ مسلمانوں میں وجوب اور فرضیت کا رنگ کہیں یہ نماز نہ اختیار کر لے آپ نے ترک فرمادیا۔ اور یہ تو فعلی مثال تھی، پیغمبر کی نظر (صلوات اللہ علیہ وسلم) کے ان دقائق پر کس حد تک رہتی تھی اس کا اندازہ اس قولی حدیث سے بھی ہو سکتا ہے جو حج کے متعلق صلح کی کتابوں میں پائی جاتی ہے مطلب یہ ہے کہ قرآن میں حج کے مطالبہ والی آیت **وَاللّٰهُ عَلٰی النَّاسِ حَاجُّ الْمَبِیْتِ مِنْ اَسْطِطَاعِ الْیَمِیْنِ سَبِیْلًا** (لوگوں پر اللہ کے گھر کا حج واجب ہے جو راہ کی استطاعت رکھے) نازل ہوئی، تو ایک صحابی نے حسب دستور قرآنی مطالبات کے اجمالی رنگ کو پیش نظر رکھ کر چاہا کہ پیغمبر سے اس کی تفصیل پوچھی جائے صحیح مسلم میں ہے کہ وہ صاحبِ اطمینان اور آنحضرت کو خطاب کر کے دریافت کیا۔

افی کل عام کیا یہ حج مسلمانوں پر ہر سال فرض کیا گیا ہے

یا رسول اللہ ﷺ اے اللہ کے رسول ﷺ

قرآنی مطالبات کا اجمالی ہونا یہ تو درست تھا لیکن اسی کے ساتھ دوسرا نکتہ جو یہ تھا کہ جس اجمال کی تفصیل عام مسلمانوں کے لئے ضروری ہوتی تھی جیسا کہ جصاص نے لکھا ہے پیغمبر پر تو خود ہی اس کی عام تبلیغ واجب تھی اور یہ کہ جن تفصیلات کی نوعیت یہ نہ تھی، عموماً پیغمبر اس سے خاموشی اختیار فرماتے تھے۔ بس یہی نکتہ تھا جو پوچھنے والے صحابی کے سامنے اس وقت ہوا روایت ہے کہ سوال کے بعد بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ خاموشی اور سکوت ہی کی راہ سے تشریع کا جو طریقہ ہے وہ انھیں سمجھا دیا جائے اس لئے باوجود ان کے دریافت کرنے کے آپ خاموش ہی رہے۔ حدیث میں ہے

فسکت (یعنی اس سوال پر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چپ ہی رہے)

مگر خدا جانے ان صحابی پر اس وقت کیا حال طاری تھا کہ آپ کی خاموشی سے بھی ان کو تنبیہ

نہ ہوئی، اور دوبارہ بھی انھوں نے اپنے سوال کو دہرایا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اب بھی خاموش ہی رہے مگر بات ان کے پھر بھی سمجھ میں نہ آئی اور نمبر ہی دفعہ بھی

افی کل عام کیا یہ حج مسلمانوں پر ہر سال فرض کیا گیا ہے
یا رسول اللہ اے اللہ کے رسول۔

وہ کہہ رہے تھے جب سوال کی توبت اس حد کو پہنچ گئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اندازہ فرمایا کہ اب خود ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آئیگی تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مخاطب فرماتے ہوئے پہلے تو لا یعنی نہیں کے ذریعہ سے جواب دیا جیسا کہ ترمذی میں ہے۔

قال لا یعنی جواب میں ارشاد ہوا کہ نہیں ہر سال فرض نہیں ہے بلکہ عمر بھر میں ان مسلمانوں پر جو زارہ کی استطاعت رکھتے ہوں ایک دفعہ فرض ہے۔ اس کے بعد مطالبات شرعیہ کی تبلیغ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جو طرز عمل تھا، اس کی تشریح ان الفاظ میں فرماتے ہوئے ان کو سمجھانا شروع کیا۔

ذر دنی ما ترکتم چھوڑ دیا کرو مجھے اس چیز میں جسے چھوڑ دیا کروں
میں تم لوگوں کے لئے۔ (مسلم)

جس کا وہی مطلب ہے جس کی طرف علامہ جصاص اور حضرت امام شافعیؒ نے اشارہ فرمایا تھا کہ جن مطالبات کی نوعیت ضرورت و وجوب کی ہے انھیں تو میں خود ہی پہنچانے پر آمیت قرآنی

یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک فان لم تفعل فما بلغت رسالتک
یا پیغمبر پہنچا دیا کرو ان چیزوں کو جو تم پر نازل کی گئی ہیں، اگر ایسا نہیں کرو گے تو تم نے اپنے پیغام کو نہیں پہنچایا۔

کے فرمان الہی سے خود ہی مامور ہوں۔ خواہ ان کا نزول وحی جلی (قرآن) کے ذریعہ سے ہو، یا قرآن کے اجمالی مطالبات کی جو تفصیلات آپ کو خدا کی طرف سے دوسرے ذرائع سے

بتائے جاتے ہوں وہ ہوں۔ اور جن امور کے متعلق یہ طریقہ اختیار نہیں کرتا بلکہ ”چھوڑ دیتا ہوں“ تو تم لوگ خواہ مخواہ پوچھ پوچھ کر اس اجمال کے کسی خاص پہلو کو متعین کرانے کی کوشش نہ کیا کرو، آپ نے بطور تمثیل کے اس کے بعد سمجھایا کہ اگر میں تمہارے سوال کے جواب میں بجائے ”نہیں“ کے ”ہاں“ کہہ دیتا تو بلاوجہ ایک ایسی بات جس میں مسلمانوں کو اختیار حاصل تھا اس میں مقید ہو جاتے، حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا

لَوْ قُلْتُ نَعَمْ لَوَجْتُ أَكْرِمَ مَا كُنتُ أَتَوْهُ بِرُوحِي وَاجِبٌ هُوَ جَانِبِي
(مسلم) ہر سال مسلمانوں پر حج فرض ہو جاتا۔

یعنی وہی بات جس کی طرف ابن عباسؓ نے بنی اسرائیل کے قصہ ذبح بقرہ میں اشارہ کیا ہے،
ان بنی اسرائیل لو اگر بنی اسرائیل کسی معمولی ادنیٰ درجہ کی گائے کو
أَحْذُوا ادْنَىٰ بَقْرَةٍ پکڑ لاتے (اور ذبح کر دیتے) تو ان کی طرف
لَا حِزْرَ عَنْهُمْ سے کافی ہو جاتا۔

مطلب یہ ہے کہ ذبح گاؤ کا جو مطالبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حق تعالیٰ کی طرف سے
بنی اسرائیل پر پیش کیا تھا، اگر بنی اسرائیل سوال کر کر کے جواب میں قیود کا اضافہ نہ کراتے جاتے
اور کوئی سی بھی گائے لا کر ذبح کر دیتے تو خدا کا مطالبہ پورا ہو جاتا لیکن جس چیز میں ان کو اختیار
تھا خواہ مخواہ پوچھ گچھ کے قصہ کو بڑھا کر اپنے لئے انھوں نے خود تنگی پیدا کر لی۔
بہر حال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حج والے قصہ میں بھی اس کی وجہ بتلاتے ہوئے

۱۵ مثلاً جبیل امین نے اگر آپ کو نماز اور وقت نماز وغیرہ باتیں بتائیں، کبھی یہ ہوتا تھا، کبھی آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کے قلب مبارک میں اس علم کا الہام ہوتا تھا جس کی تعبیر نفث فی روحی (میرے دل میں پھونکا گیا)
سے فرماتے تھے، علما کا یہ بھی خیال ہے کہ منکوث نبوت کی روشنی میں بھی بعض محملات کی تفصیلات آپ پر واضح
ہو جاتی تھیں۔ بہر حال جو کچھ بھی تھا ”انھو لا وحی یوحی“ ہی تھا (یعنی نہیں ہے وہ مگر جو آپ پر
وحی کی جاتی ہے)۔ ۱۶ مجمع الفوائد ج ۲ ص ۷۲۔

برہان دہلی

۲۴۱

کہ جن مطالبات میں ضرورت اور شدت کا رنگ نہیں ہوتا جن کا پہنچانا منصب نبوت کے لحاظ سے پیغمبر کے ضروری اور ناگزیر فرائض میں نہیں ہے۔ مثلاً یہی بات کہ ہر سال کسی مسلمان کو اگر حج کی توفیق ہو تو ظاہر ہے کہ ایک ایسے کام کی اُسے توفیق بخشی گئی، جس کی فضیلتوں اور رفعتوں کا کون اندازہ کر سکتا ہے، مگر باوجود ان فضیلتوں کے ہر سال حج کرنا چوں کہ فرض نہ تھا اس لئے بجائے تبلیغ عام کے سکوت اور ترک کا طریقہ کیوں اختیار کیا گیا، اسی حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا۔

لَوْ قُلْتُ نَعْمَ لَوَجِيتُ وَلَمْ أَاسْتَطَعْتُمْ وَأَنَا أَهْلًاكَ
اگر میں ہاں کہہ دیتا تو وہ واجب ہو جاتا اور تم پھر اسے سنبھال نہ سکتے، جو لوگ تم سے پہلے تباہ
مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ كَثْرَةً
ہوئے وہ سوالوں کی کثرت ہی سے تباہ ہوئے
سَوَالِهِمْ وَاخْتِلَافُهُمْ عَلَى
اور اس لئے تباہ ہوئے کہ اپنے پیغمبروں کے
اَنْبِيَائِهِمْ -
متعلق مختلف ہونے لگے۔

مقصد مبارک یہی تھا کہ امت کی سہولت اور حتی الوسع ان کے لئے ممکنہ گنجائش پیدا کرنا، میری اس خاموشی کا یہی سبب ہوتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے فضائل کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حتی الوسع ترک ہی کا طریقہ اختیار فرمانا چاہتے تھے۔

لیکن اگر اہل کلیہ خاموشی ہی اختیار کر لی جاتی تو جو لوگ ان فضائل کو حاصل کرنا چاہتے تھے ان کو عمل پر ابھارنے والی کوئی چیز نہیں رہتی۔ یہی راز ہے کہ عام تبلیغ کے لحاظ سے سکوت اختیار کرتے ہوئے خصوصی طور پر بعض لوگوں کو ان کے فضائل پر بھی مطلع کر دیا جاتا تھا، یہی حج پر جس کے متعلق عام طریقہ بیان تو یہ تھا، لیکن جن صحابہ نے ایک سے زیادہ دفعہ حج کیا اور ان میں مشکل ہی سے کوئی ہوگا جو اس فضیلت سے محروم ہو، حتی کہ حسین علیہما السلام کے متعلق تو سب ہی جانتے ہیں کہ کوئل سوار یوں کو ساتھ رکھنے کے باوجود ان نبی زادوں نے پچیس پچیس حج کو صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بخاری وغیرہ میں نفلی حج کے فضائل کی جو حدیث مروی ہے

اس کے آخر میں یہ بھی ہے کہ

فلادع الحجمرہ اذ سمعت هذا پس نہ چھوڑا میں نے حج کو جب سے رسول اللہ
من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات سنی۔

ظاہر ہے کہ یہ اثر ان ہی حدیثوں کا ہے جو عام نہیں بلکہ تبلیغ خاص کی راہ سے صحابہ
میں پہنچی تھیں حتیٰ کہ اس سلسلہ میں تو بعض صحابہ کے متعلق یہاں تک بیان کیا جاتا ہے مثلاً
حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ وہ کہتے تھے مجھ سے رسول اللہ نے
فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

ان عبدا اذا صحت بدنه ایک بندہ جس کے بدن کو میں نے چاق و تندرست
واوسعت علی فی الرزق رکھا اور روزی میں اس کے وسعت عطا کی،
ولم یفقد علی فی کل اربعة باوجود اس کے ہر چار سال بعد وہ میرے یہاں
اعوام المحروم۔ ۱۷۲۵ھ آیا تو ایسا آدمی محروم ہے۔

یعنی مواقع رکھتے ہوئے زندگی کی ایک بڑی قیمت سے محروم رہا، اور سچی بات بھی یہی ہے کہ
معمولی دنیاوی بادشاہوں کی ڈیوڑھیوں میں کسی کو باریابی کا موقعہ اگر مل جاتا ہے تو حتیٰ الوسع
حاضر باش ہونے کی کوشش سے نہیں تھکتا، اگر کسی دن ناغہ ہو جاتا ہے تو اسے اپنی بڑی محرومی
سمجھتا ہے بلکہ حج میں نوبات کچھ اس سے بھی آگے بڑھی ہوئی ہے کہ حکومت سے زیادہ محبت و عشق
کی جلوہ نمایوں کا خاصہ اس عبادت میں زیادہ ہے، کون عاشق ہو گا جو محبوب کے در کی رسائی
کے امکان کو پاتے ہوئے قصداً محروم بنے گا۔

خیر یہ تو الگ بات ہے، میں یہ کہہ رہا تھا کہ جس عمل میں حنات، رفع درجات کی یہ
کیفیتیں پوشیدہ ہیں، اس کے متعلق بھی جب تبلیغ عام کو نہ پسند فرمایا گیا بلکہ وہ راہ اختیار کی گئی جس
کی وجہ سے بجائے استفاضہ اور شہور عام کے اس کی حیثیت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں

۱۷۲۵۔ ۱۷۲۶ھ ایضاً ص ۱۶۴۔

خبر الواحد عن الواحد حتى ينقضي الى
 ایک کی خبر ایک سوتا ایک اسے طریقہ رسول اللہ

النبي صلى الله عليه وسلم - صلى الله عليه وسلم تک وہ خبر پہنچے۔

کی ہو گئی، آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ کسی اتفاقی حادثہ کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ سمجھ بوجھ کر انسانی فطرت کے ساتھ پیغمبر کے اقوال و اعمال کا جو تعلق ہے، اور جسے قدرنا ہونا ہی چاہئے۔ اسی کو پیش نظر رکھ کر قصداً و عمدہ یہ طریقہ اختیار کیا گیا، تبلیغ عام کی صورت میں اندیشہ تھا کہ جس گنجائش کو ان امور میں شریعت قصداً باقی رکھنا چاہتی ہے کہیں آگے چل کر تنگی کی شکل نہ اختیار کر لے۔

لیکن یہ رعایتیں تو ہم جیسے عوام کے لئے تھیں جن کے لئے آج ان وجوہی مطالبات سے بھی عہدہ براہونا دشوار ہو رہا ہے، جن کے وجوب و فرضیت میں شک و شبہ کی قطعاً کسی حیثیت سے کوئی گنجائش نہیں ہے، ہر سال والے کو تو جانے دیجئے، عمر بھر میں ایک دفعہ جو حج فرض ہے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر فیصلہ کرنے والے فیصلہ کر سکتے ہیں کہ استطاعت کے انتہائی مرتبہ پر رہنے کے باوجود کتنے سال گزرے اور گزر رہے ہیں جن میں بہتوں کے دل میں تو ادائی فرض کا کوئی خطرہ بھی نہیں گذرا ہے اور جن کے اندر احساس فرض کے جذبہ میں کبھی حرکت بھی ہوتی ہے تو کتنے جیلے اور پہلے اٹھ اٹھ کر اسے سکون سے بدل دیتے ہیں مہتیل و تسلیف کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے جو جاری ہے۔

لیکن ہم کوتاہ نصیبوں کے ساتھ ساتھ آخر آدمی کی اولاد میں بیدار بختوں اور بلند نگاہوں کا وہ طبقہ بھی تو ہے جو پیغمبر کی ہر ادا پر قربان اور ان کے ادنیٰ ادنیٰ اشاروں کا نگہبان بنا ہوا ہے آواز آئی کان میں کہ میرے محبوب نبی کا یہ منار مبارک تھا، اس سے بحث نہیں کہ فرض ہے یا واجب، سنت ہے یا مستحب، اولیٰ ہے یا افضل، تو اتر کی راہ سے یہ بات پہنچی ہے یا شہرت و استغاضہ کے طریقہ سے، خبر احاد ہے یا مشہور بہر حال اس کی تعمیل ہی کو مقصد حیات بنائے ہوئے ہیں جو کچھ مل سکتا ہے اسے کیوں چھوڑا جائے ”دین“ میں یہی ان کا حال ہے جیسے ابنہ الدنیا میں وہی اقبال مند سمجھے جاتے ہیں جنہوں نے جو کچھ مل سکتا تھا، جس راہ سے

بھی مل سکتا تھا اس کے حاصل کرنے میں سستی اور کاہلی سے کام نہ لیا ہو۔

امت ہی کے آخریہ بھی افراد تھے، ان کا خیال بھی ضروری تھا، یہ ان ہی کی خاطر منظور تھی کہ تبلیغ عام کی راہ کی پوری نگرانی کرتے ہوئے کسی نہ کسی طرح ان چیزوں کو بھی پیغمبر نے آخر پہنچا ہی دیا، جن کے ترک کرنے والے تو مواخذہ کے دائرہ سے نکل جاتے ہیں۔ لیکن جو ان سے نفع اٹھانا چاہتے ہیں وہ بھی محرومی سے محفوظ ہو گئے۔ یعنی خبر الخاصہ عن الخاصہ امام شافعیؒ کے الفاظ میں یا الواحد بعد الواحد جصاص کے الفاظ میں، یا عام اصطلاح میں جسے خبر آحاد کی راہ کہتے ہیں۔ یہ چیزیں بھی امت تک بہر حال پہنچ ہی گئیں۔

(باقی آئندہ)

اچھی کتابیں

- ابن رشد۔ موسیورنیاں۔ اسپین کا نامور فلسفی
جس کی تصانیف صدیوں یورپ کی درس گاہوں
میں پڑھائی جاتی ہیں اس کے سوانح حیات اور
فلسفہ کی مفصل تشریح۔ 5/-
یورپ (۱۹۱۸-۱۹۳۹) مترجمہ شیر محمد اختر۔ 3/-
چمنستان۔ مولانا ظفر علی خان کا تازہ مجموعہ کلام۔ 5/-
تاریخ عالم۔ ایچ۔ جی ویلز (جلد اول)۔ 5/-
اسلامی تہذیب۔ پروفیسر بارٹولڈ۔ 3/-
جمہوریہ فلاطون۔ دینکے سب سے بڑے مفکر کے
شجر علم کا پختہ ٹمر اور جماعات انسانی کے عروج
زوال کا مرقع۔ 5/8/-
دستور نفسیات۔ پروفیسر ولیم جیمس۔ 5/8/-
آسان علم معاشیات۔ چوبے۔ 5/-
علم تمدن۔ گورکھ ناتھ۔ 4/-
رکمل باتھویر فہرست مفت طلب فرمائیں

کنول بک کلب 5/12 ڈبی بازار لاہور